"کچھ نہیں . . . گلنار نے شادی کر لی۔"

"شادی کر لی ؟ . . . کس سے ؟ . . . کیوں . . . کہاں ؟ . . ." ظفر کو چند لمحوں کے لئے رشتہ بالکل بھول گئی۔

"بس شادی کر لی۔ کرنے والوں سے . . ."

"کچھ بتاؤ تو سہی . . . یار . . . . وہ . . . تو . . . وہ تو تم سے محبت کرتی تھی"

"ہاں . . . اور کرتی ہے اب بھی . . ."

"پھر اس نے . . . شادی کیوں کر لی کسی اور سے . . ."

غازی نے اس بات کا بڑی دیر تک کوئی جواب نہ دیا۔ کھڑکی میں کھڑا وہ ان لڑکوں کو دیکھتا رہا جو لان میں ٹینس کھیل رہے تھے۔

"کیسے ۔ کیسے ۔ کیسے ؟"

"ہیرا منڈی کے اپنے اصول ہیں یار ! وہاں کی سائیکلوجی سمجھنا ہو تو پتہ چلے ساری سائیکلوجی گھر چھوڑ کر جانا پڑتی ہے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"گلنار مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس لئے وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔ یہ وہاں کی سائیکلوجی ہے۔"

"کیا ؟"

"سوال مت کرو مجھ سے . . . میں . . . تمہیں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔"

لیکن جب ظفر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا تو غازی خود بھی آہستہ آہستہ بولنے لگا۔۔۔ جیسے بھری گرمی کی دوپہر میں التماش کے پھول جھڑ رہے ہوں۔

"میں نے کئی دفعہ پہلے بھی اسے گلنار کے کوٹھے پر دیکھا تھا۔ جس طرح ہزارے کے پٹھان ہوتے ہیں۔ اونچا لمبا قد، سرخی مائل رنگ۔۔۔ لیکن وہ موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ اس کی سیاہ واسکٹ میں چھوٹی سی توند بھی نظر آتی تھی۔ جب بھی وہ گلنار کے کوٹھے پر آتا تو اپنی سفید پگڑی کے لڑ سے منہ ڈھانپے ہوتا۔ اسے گلنار سے بڑی محبت تھی۔ کینوس کے تھیلے میں نوٹ بھر بھر کر لایا کرتا تھا وہ۔۔۔۔"

"کیا نام تھا اس کا۔۔۔"

"صاحب خان۔۔۔"

"بڑا خوبصورت نام ہے۔"

"کسی زمانے میں خود بھی بہت خوبصورت ہوگا۔ اب تو صرف قدوقامت کے سبب خوبصورت لگتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے گلنار کا مجرا جاری تھا۔ میں بھی گیا ہوا تھا گلنار بار بار میری طرف آتی تھی۔ صاحب خان نے سو سو روپے کا نوٹ منہ میں لے کر گلنار کو اشارہ کیا۔ لیکن وہ ادھر نہ گئی۔۔۔ نہ جانے کیوں گلنار صاحب خان سے اس قدر چڑتی تھی۔ جتنا وہ اس کے پیروں تلے ہاتھ رکھتا اسی قدر وہ چونکیل چیتے کی طرح بھڑکتی۔۔۔"

"بہت زیادہ عمر تھی اس کی؟"

"چالیس پینتالیس سے زیادہ نہ ہوگی لیکن گلنار کی نفرت کی وجہ یہ نہ تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتی تھی۔ غازی ان کوٹھوں کا اور ہی حساب ہے۔ جن سے ہم پیار کرتے ہیں انہیں کوٹھے پر چڑھنے نہیں دیتے۔ اور۔۔۔ اور جو کینوس کے تھیلے میں نوٹ لاتے ہیں ان کی ہر طرح ناز پروری ہوتی ہے۔۔"

"لیکن بی بی جی تمہاری تو بہت خاطر مدارات کرتی تھیں۔۔۔ یاد ہے انہوں نے مجھے بھی بیڑے کھلائے تھے۔"

"کیونکہ ان کا اپنی بیٹی سے خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا۔"

"کیسا معاہدہ۔"

"گلنار ان سے وعدہ کر چکی تھی کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔"

"لیکن یہ وعدہ کس لئے۔۔۔ آخر؟"

"تم اتنے سوال پوچھو گے تو مجھے بھی یاد نہیں رہے گا کہ کس بات کا جواب کس دن سے شروع ہوتا ہے۔"

ظفر نے نیا سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لئے تو غازی نے اپنی داستان جاری کی۔۔۔

"وہ کلا بھٹ سے آیا کرتا تھا۔ کینوس کے تھیلے میں نوٹ لے کر۔۔ ایک موتیے کا ہار گلنار کے گلے میں ڈالنے کے لئے اس نے بی بی جی کو ڈھائی ہزار روپے دیئے تھے۔۔ اس کی محبت دیکھ کر کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا تھا اپنی محبت پر۔۔"

"کیا مطلب ؟"

"جو شیفتگی اس کی نظروں میں ہوتی۔ جس طرح وہ گلنار کی فرمائشیں پوری کرتا۔ جیسے وہ بی بی جی کے اشاروں پر ناچتا۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے مجھے گلنار سے محبت نہیں ہے۔ گلنار کے ایک ادنیٰ اشارے پر وہ ہزاروں خرچ کرتا اور خوش ہوتا۔"

"جوانی کے پاس دینے کو سوائے دل کے اور کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ غازی!۔۔۔ جب بوڑھا آدمی دل نہیں دے سکتا تو وہ دولت کا دل بنا کر پیش کرتا ہے۔"

"یہی گلنار کہتی تھی۔"

"کیا؟"

"کلا چھٹ جانے سے پہلے وہ مجھے ملی تھی۔ کہنے لگی۔ غازی! ہمارے پیشے کی عورتیں اوّل و آخر اسی بازار میں آتی ہیں۔ جب صاحب خان مجھے اس بازار میں واپس چھوڑ جائیگا تو مجھے ملنے آنا۔۔۔۔ میں نے اس کی کلائیاں پکڑ کر کہا تو پھر تم کیوں جا رہی ہو اس کے ساتھ۔۔۔ وہ رونے لگی۔۔۔ تم نے گلنار کو دیکھا ہے دیکھا ہے ناں؟ جب وہ روتی ہے تو دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔۔۔ یہ لاہور ہڑپے کی صورت ویران ہو جاتا ہے۔ آسمان سے زمین تک زرد آندھی چلنے لگتی ہے۔"

ظفر اور غازی دیر تک آہیں بھرتے رہے۔

"تم نہ جاؤ گلنار .... نہ جاؤ مجھے .. چھوڑ کر نہ جاؤ گلنار ....."
بڑی دیر رو چکنے کے بعد وہ بولی .. کیسے نہ جاؤں ؟ غازی! میں چار بار نتھنی پہن چکی ہوں - ہر بار مجھے کنواری بنا کر نوچی بنا کر یہ لوگ میرا نکاح کرتے ہیں .... چار مرتبہ میرا نکاح ہو چکا ہے - اور پھر بھی میں پیشہ کرتی ہوں - میں اس رسوائی سے اس ذلت سے تھک گئی ہوں - گلنار .... تو چلو .. میرے ساتھ چلو گلنار! ہم .... یہاں سے ہیں دور چلے جائیں گے .. تو وہ نہیں مانی پھر ..."

"طوائف زادی کسی کے کہنے سے کبھی کچھ نہیں کرتی - کہنے لگی - روز روز کے نت نئے گاہک کے ساتھ گناہ کرتے دکھ ہوتا ہے غازی! مجھے کلاپھٹ چلے جانے دو - وہ مجھ سے محبت کرتا ہے - میں نے گلنار کے پاؤں پکڑ لئے اور اس کی بہت منتیں کیں - میں نے اسے ہر طرح منایا لیکن وہ مانی نہیں"

کمرے میں عرصہ تک خاموشی چھائی رہی جیسے وہ دونوں گلنار کو منانے میں مشغول ہوں ..

"جب میں اٹھنے لگا تو وہ پچھلی طرف سے آئی - اور میری پیٹھ سے سر جوڑ کر بولی - دیکھتے نہیں سارا بازار ان عورتوں سے بھرا پڑا ہے جو ہیرا منڈی سے اٹھ کر شہر کی طرف گئی تھیں - دیکھتے نہیں سارے بازار میں ان عورتوں کی تعداد زیادہ ہے جن کے نکاح ہو چکے ہیں - دیکھتے نہیں یہاں ان عورتوں کی بھرمار ہے جو محبت کی خاطر بازار سے نکلیں، گھر سے نکلیں اور پھر جوتیاں کھا کر واپس آئیں ....

تیسرا دور

ڈمپلے کے گھر آکر سب سے پہلے رشو جان نے
کہیں خالہ پیش بندی کے طور پر آناں کو خط نہ لکھ دیں
مٹا دیئے تھے اور ان ہی مٹے ہوئے حروف پر رش
کریں گے... لکھا تھا...

پیاری آناں جان!

السلام علیکم۔

میں آج خالہ جان کا گھر چھوڑ کر
ہوں۔ وجہ اتنی تکلیف دہ ہے کہ میں خطوں میں اس
کا الزام لگایا بلکہ میرے منہ پر چانٹا بھی مارا۔ مجھے م

ۓ امّاں کو خط لکھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ
خط پر جابجا آنسوؤں نے حروف
تو لکھ اعتماد تھا کہ وہ اس کی وکالت

ر اپنی ایک سہیلی شکیلہ کے پاس آگئی
ں کا ذکر نہیں کر سکتی۔ خالہ نے مجھ پر کوڑا لگ
رحوم ابّا جی کی قسم! امّاں میں بے قصو

ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔۔ میں جیسی آپ کے پاس سے آئی تھی ویسی ہی ہوں میں نے یہاں کے ایک ہوسٹل میں کمرے کے لئے درخواست دے دی ہے جو کہ منظور ہو گئی میں نیو ماڈرن ہوسٹل لاہور میں چلی جاؤں گی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ میری دوست بہت شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ ماں مر چکی ہے آباجی ان کے دمے کے مریض ہیں۔ یہ لوگ بھی بیچارے ہماری طرح ہیں۔ سوائے دولت کے کسی چیز کی کمی نہیں۔۔ میں یہاں صرف چند دن ٹھہرونگی اور بعد ازاں ہوسٹل میں چلی جاؤں گی۔۔ صرف پانچ ماہ کی تو بات ہے۔ امتحان سر پہ ہیں۔ ایک لمحہ کی فرصت نہیں ہوتی۔۔ آپ میرے لئے دعا کریں۔ کاش میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں!

نذری تو مجھے یاد ہی نہیں کرتی۔۔ نہ خط کبھی لکھتی ہے نہ کبھی آپ کے خط میں سلام لکھواتی ہے۔ خالد اور راشدہ کیسے ہیں۔ انہیں میرا پیار دیں۔ کبھی کبھی تو دل اس قدر اچاٹ ہو جاتا ہے کہ جی چاہتا ہے پر لگ جائیں اور میں بہاولپور جا پہنچوں۔۔ اچھا اب منزل کچھ ایسی دور نہیں۔ اللہ نے چاہا تو پھر ملیں گے۔ جلد بہت جلد۔ میرے حق میں ضرور دعا کریں۔

ہمیشہ آپ کی تابعدار

"رشو"

یہ خط پوسٹ کرنے کے لئے اس نے اپنے پرس میں ڈال لیا۔۔ وہ ہمیشہ کالج کے پھاٹک کے سامنے جو لال دھوتو نصب تھا اس میں اپنے خط پوسٹ کیا کرتی تھی

دوسرے دن جب وہ ڈمپل کے ساتھ سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ سے نکلی اور سڑک پار کر کے لال ڈبے تک پہنچی تو معاً ایک سیاہ کار پیچھے سے آکر رکی۔ بریکوں کی آواز سے ساری ٹریفک میں بھی کھلبلی مچ گئی۔۔ ایک رکشا گرتے گرتے بچا۔۔ رشو اور ڈمپل کلانچ بھر کر فٹ پاتھ پر ہو گئیں۔ مڑ کر دیکھا یہ کار ملک صاحب کی تھی۔ اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

ڈرائیور نے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا تو ملک صاحب نیچے اترے۔ بڑی شائستہ سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی۔

"سلام علیکم"

لڑکیوں نے جھٹ سروں پر دوپٹے لے لئے۔

"آپ لوگ کہاں جا رہی ہیں۔ میں آپ کو پہنچا آؤں۔"

"جی نہیں۔ شکریہ"

ڈمپل نے رشو کے بازو میں ہلکی سی چٹکی لی۔

"ابھی تک آپ کے دل میں غصہ ہے۔"

"جی نہیں! یہ بات تو نہیں ہے۔" رشو جلدی سے بولی۔

"پھر آیئے ناں! بیٹھئے۔۔۔" عقبی دروازہ کھول کر ملک صاحب بولے۔

"جی ہم تو بازار جا رہی ہیں۔"

"عجب اتفاق ہے! میں بھی بازار جا رہا ہوں۔ کچھ کتابیں خریدنا ہیں مجھے۔ آپ

لوگ اپنی خرید و فروخت کیسے گا اور میں کتابیں خرید لوں گا۔"

بڑی جائز سی بات تھی۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر اکڑوں بیٹھ گئیں۔

انار کلی میں وہاں جہاں ڈھائی ڈھائی آنے میں ہر مال والی ریڑھیاں اور آٹھ آٹھ آنے میں ہر مال والے ترپال پر اپنا پلاسٹک کا سامان ۔ آئینے، چمچ، قینچیاں، ریزر، چابیوں کے چھلے وغیرہ لگائے بیٹھے تھے۔ بالکل ان کے سامنے ملک صاحب باوردی ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کر دی۔ اور مودب طریق سے پچھلی سیٹ کا در کھولا۔

نئی کار کا دروازہ جب باوردی ڈرائیور کھولتا ہے تو پیروں تلے آپ ہی آپ راج ہنس آجاتے ہیں۔۔ انسان سڑک پر نہیں چلتا۔ کنول کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تالاب میں بجرے پر سیر کرتا ہے۔

ملک صاحب رشو اور ڈمپل کے ساتھ اس طرح چلنے لگے جیسے ملکہ کا باڈی گارڈ چلتا ہے۔ انہیں لاہوری دروازے کے پاس کسی مکتبے پر جانا تھا۔ لیکن راہ میں ساری انار کلی پڑی تھی۔ ڈمپل نے جوتا خریدا تو ملک صاحب اپنا پن ٹھیک کرواتے رہے لیکن جب رشو نے نائلون کی ساڑھی خریدی تو ملک صاحب نے جلدی سے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں سے پرانی لفافے کے مشابہ وہ بٹوہ نکالا جو وہ قاہرہ سے لائے تھے۔

"جی نہیں شکریہ! میں خود ادا کروں گی پیسے۔ میرے پاس ہیں جی۔"

"آپ مجھے کار میں پہنچ کر لوٹا دیجیے گا . . ."

یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر کی طرف چلے گئے اور ساڑھی کی قیمت جلدی سے ادا کر دی . .

جب وہ ڈمپل اور رشو بازار کے اندر داخل ہوئیں تو ملک صاحب ان سے رخصت ہو کر لاہوری دروازے کی جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن جب وہ دونوں اس اندھیری بند گلی سے باہر نکلیں جہاں ہر پوشیدہ شے کو عیاں طور پر ٹانگا گیا تھا تو ملک صاحب عین گلی کے باہر اس جگہ کھڑے ہو گئے جہاں پلاسٹک اور ربڑ کے ہوائی چپل بکتے ہیں۔

"میں نے سوچا واپسی پر آپ کو ساتھ ہی لے چلوں . ."

"جی . . . ابھی تو ہمیں بہت کچھ خریدنا ہے۔ ہم خود گھر چلی جائیں گی . ." رشو نے جلدی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں مجھے بھی کوئی کام نہیں، آپ کے ساتھ چلتا ہوں . ."

دو نوجوان لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بشرطیکہ آپ مجھ بڈھے کی کمپنی برداشت کریں"

"ہائے جی . . کیسی باتیں کرتے ہیں آپ . . ؟ ہم تو آپ کے لئے کہہ رہے تھے یعنی آپ کو دیر نہ ہو جائے کہیں . ."

"تو پھر چلیں، مجھے تو ایسا کوئی کام نہیں ہے"

بازار میں بہت رش تھا۔ جگہ جگہ ملک صاحب کو راہ بنانا پڑتی۔ اور رشو اور ڈمپل کو اس طرح گذرنا پڑتا کہ باقی لوگوں سے تو وہ چھو نہ سکتیں لیکن ملک صاحب کو چھو کر یا

ان سے رگڑ کر یا ان کا سہارا لے کر آگے بڑھنا پڑتا۔ ایک بار جب پیچھے سے ایک کار آگئی اور موڑ سے ایک رکشا نے گذرنا چاہا تو رشو مرتے مرتے بچی۔ اگر ملک صاحب جلدی سے اس کا ہاتھ گھسیٹ کر آگے نہ نکال لیتے تو رشو جان اس جہانِ فانی سے عین انارکلی میں رخصت ہو جاتی۔ ایسے میں ملک صاحب کے ہاتھ کی فولادی گرفت کو رشو نے بڑا محسوس کیا۔ لمحہ بھر کے لئے وہ ملک صاحب کی آغوش میں آ رہی۔ یہ واقعہ ملک صاحب کے لئے بڑا اہم تھا۔ اس نے ان پر ایسی برقی لہر دوڑا دی تھی جس کے اب وہ اپنے آپ کو اہل نہ سمجھتے تھے۔

جب رشو ان کی بھاگنی کی میز پر ظفر کے خط رکھ کر گئی تو ان کے دل میں میں اپنے بیٹے کے خلاف بڑا غصہ بھرا تھا۔ انہوں نے اسی رات کو جب ظفر سیکنڈ شو سے لوٹا تو اسے آواز دی۔ اس وقت خط الماری میں مقفل تھے۔ ظفر نے دل میں سوچا کہ شاید وہ اس کتاب کے متعلق استفسار کرنا چاہتے تھے جو انہوں نے کچھ عرصہ پہلے اسے مستعار دی تھی۔۔ وہ سگرٹ پیتا اندر داخل ہوا۔

"سگریٹ پھینکو۔۔۔"

آواز میں تنبیہ تھی۔

ظفر نے زمین پر سگریٹ پھینک کر بوٹ سے مسل دی۔

"بیٹھ جاؤ۔۔"

ظفر بیٹھ گیا۔۔

"مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"جی، پوچھیے۔"

"پہلے تمہیں اس بات کا یقین دلانا ہوگا کہ تم سچ بول رہے ہو۔"

ظفر نے پہلو بدل کر آہستہ سے کہا۔

"اب یہ کیونکر یقین دلایا جا سکتا ہے۔"

"میں تم سے Gentleman's Word چاہتا ہوں۔"

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بولنا بے معنی سمجھتا ہوں۔ جب آپ نے آج تک سچ بولنے پر کوئی سزا نہیں دی تو میں جھوٹ کیونکر کہہ سکتا ہوں۔"

"لیکن اس بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ سزا نہیں ملے گی۔"

ظفر نے لمحہ بھر کے لئے باپ پر نظر ڈالی۔ اس طرح ملک صاحب کا چہرہ اس وقت تابناک ہوا تھا جب ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ان کو دل کا عارضہ ہے۔ اور خوراک کے معاملے میں انہیں بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ جنسی زندگی ختم... خوراک کم اور سادہ... آرام زیادہ... چنانچہ ان کی زندگی کو ڈاکٹر صاحب کے ارشادات نے تیسری منزل پر منتقل کر دیا تھا۔

"اگر آپ مجھے سزا کا مستحق سمجھیں گے تو میرا سرِ تسلیم خم پائیں گے..."

اسے معلوم نہ تھا کہ نوبت خطوں تک آسکتی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے امّی سے لڑ جھگڑ کر سو روپیہ زائد لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ امّی ساری بات ابّا سے کہہ چکی

ہیں...

ملک صاحب نے نمبروں والا تالا کھولا۔ اِس تالے کا نمبر صرف وہی جانتے تھے۔ اور اِس الماری میں جائیداد کے انتقال نامے، دفتر کی ضروری فائلیں، اپنے پرانے دوستوں کے مخصوص خط اور ان کے قیمتی پن اور چاروں گھڑیاں بند تھیں...

انہوں نے درمیانی شیلف میں سے ٹافیوں کا ڈبہ نکالا۔

"اسے پہچانتے ہو؟"

ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اِس میں کیا ہے؟"

"ٹافیاں..."

ملک صاحب نے ڈھکنا کھول کر ڈبہ میز پر رکھ دیا۔ اور ایک لفافہ نکال کر بولے۔

"یہ لکھائی پہچانتے ہو؟"

ظفر لفافوں کو پہچانتا تھا۔ ان ٹکٹوں کو پہچانتا تھا جو لفافوں پر لگی تھیں۔ سارا تین منزلہ مکان اس کے پیروں تلے سے نکل گیا۔

"پہچانتے ہو اِن خطوں کو..."

ٹھنڈے پسینے کی ایک باریک سی دھار اس کی ریڑھ کی ہڈی پر رینگنے لگی۔

"جی۔"

"پھر؟"

"یہ خط میں نے لکھے ہیں۔۔"

"کیا ان خطوں کا جواب بھی ملا ہے تم کو؟"

"جی۔" آہستہ سے ظفر بولا

ملک صاحب کو رشتو پر طیش آگیا۔ وہ تو کہتی تھی کہ جواب نہیں دیا گیا خطوں کا۔۔

"لاؤ وہ خط میرے پاس۔۔۔ کتنے ہیں کل۔۔"

"ایک ہے جی۔۔۔ کل۔۔۔"

"اور کیا لکھا ہے اس اکلوتے خط میں؟"

"کہ میں اسے خط نہ لکھا کروں۔۔"

"جانتے ہو تمہارے خطوں کی اسے کیا سزا بھگتنا پڑی ہے۔"

"سزا؟۔۔۔ اسے سزا کیسی؟ اس کا کیا قصور ہے؟"

"اس کا قصور یہ ہے کہ بغیر قصور کے اسے خط آتے ہیں۔۔۔ اس بے قصوری کی پاداش میں ہی اسے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔۔"

ظفر دل ہی دل میں یہ سوال دیر تک دہراتا رہا۔

"اب بتاؤ جس لڑکی کا کوئی قصور نہ ہو۔۔ جس نے تم سے راہ و رسم ہی نہ رکھی ہو، اس کی شرافت کا یہ اجر ہونا چاہیے۔"

"میری نیت نیک ہے ابا جی۔۔۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔"

... آپ ... اگر ... اجازت دیں تو میں کل اس سے نکاح ...

"جس نے تمہارے خطوں کا جواب نہیں دیا کیا وہ اتنی جلدی تم سے نکاح پر رضامند ہو جائے گی۔"

مشکل یہ تھی کہ شدتِ جذبات نے ظفر کو کبھی رشوکے مسائل، اس کا عندیہ، اس کا نکتۂ نظر سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔

"میری تمنا ہے کہ اب تم اس بے قصور کو تنگ کرنا چھوڑ دو۔ اور اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ اگر امتحانوں کے بعد بھی تمہاری جنون خیزیاں بدستور رہیں تو ہم خود تمہارا نکاح وہاں کر دیں گے۔"

"ابا جی۔"

"تمہاری سزا یہی ہے کہ اب تم پھر اسے کبھی خط لکھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"جی۔۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔۔۔ اور وعدہ ایفا کرنا اپنا۔۔۔"

ظفر اپنے کمرے پہنچا تو سڑک والی کھڑکی سے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور سگریٹ سلگا لی۔ یہ انسان بھی کیا احمق چیز ہے! چاند پر کمند پھینکنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور اتنا معلوم نہیں کہ ساتھ والے کے دل میں کیا ہے؟ ٹیلیفون ایجاد کر کے الاسکا میں بیٹھا ہوائی جزیرے میں چھٹیاں منانے والی لڑکی سے بات کر لیتا ہے۔ اور یہ تک نہیں جانتا کہ ساتھ والی کرسی پر جو دستانے

پہنے مفلر لپیٹے بیٹھی ہے وہ کیا کہنا چاہتی ہے ؟'

ظفر کے سارے قیاسے غلط نکلے ؟ اس کے سارے اندازے بے بنیاد تھے ؟ چہرہ شناسی اور عندیے کی کھوج میں وہ سراسر فیل ہو گیا تھا۔

وہ جو رشو نے مجھ سے پن مانگ کر نوٹس لکھے تھے ۔ پہلے پن دینے اور اس کے بعد لینے میں جو ان کی آنکھیں اور انگلیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتی تھیں تو کیا وہ ایک حادثہ تھا ؟

ہر مرتبہ ظفر اس کی کتاب میں جب اپنا خط رکھتا اور وہ چور نظروں سے اسے دیکھ کر مسکراتی ۔ اس لمحے جب ظفر کا دل بلیوں اچھلتا تو کیا اس کی کچھ بھی ذمہ داری رشو پر نہ تھی ۔ ۔ ۔ ؟

اردو مباحثے کے روز جب وہ ظفر کے عین سامنے والی قطار میں بیٹھی طیبہ اور گلنار سے باتیں کرتی تھی اور اس کا آدھا چہرہ ظفر کی جانب ہو جاتا تھا ۔ تب ان کنکھیوں کی باتیں کیا جھوٹ تھیں ؟

یہ ضرور ہے کہ رشو نے اس کے خطوں کا جواب نہیں دیا اور کہیں اس سے باتیں کرنے کو نہیں ٹھٹکی لیکن سوئمنگ گالا کے دن جب بیک سٹروک ریس میں ظفر تیرتا ہوا لڑکیوں کی سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو رشو نے سوئمنگ میں دھاگا پرونے والی ریس میں اسی کا ساتھی بننا قبول کیا تھا ۔ وہ چھوٹی چھوٹی ادائیں ۔ ان کہی محبت کی باتیں قلبی تعلق کا چھپا چھپا اظہار ۔ ۔ ۔ کیا اتنی ساری لگاوٹیں جھوٹ تھیں ؟ ۔ ۔ ۔ سب

عادتاً یا مرزناً اس سے حسنِ سلوک کیا جا رہا تھا۔

چاندنی نے سرنج کی طرح اس کے جسم میں پیوست ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں ان آنسوؤں کی چبھن تھی جو اس کی پلکوں تک نہ آسکے تھے۔ کھڑکی میں سارے خط اور ٹافیوں کا ڈبہ پڑا تھا۔ محبت کا اظہار، سیپ کے موتی کے بجائے وہ لاش بنا ہوا تھا جسے بجّو قبر سے نکال کر چور راستے میں چھوڑ جائیں۔

کہتے ہیں کہ تین شہزادے کہ ایک ایک سے بڑھ کر گوہرِ نایاب تھا کھلے جنگل میں ہرنیاں کا شکار کھیلتے تھے۔ پہر دو پہر شکار کھیلا، پھر سستانے کو کنارِ دریا پر آ بیٹھے۔ اور کمر سے ترکش کھول کر رکھ دیئے۔ وہیں آ گیا ایک سوداگر بچہ پریشان حال اور دزدیدہ نگاہ ادھر آیا اور کہنے لگا "صاحبو! تم نے کہیں میرا اونٹ تو ادھر جاتے نہیں دیکھا"۔۔ پہلا شہزادہ کہ حسن و جوانی میں بے مثل تھا بولا "تیرا اونٹ کانا تھا کیا؟" سوداگر بچہ نے اس کا گریباں کھینچا اور رطیلا یا کہ بتا میرا اونٹ تو نے کہاں چھپایا ہے؟ کیونکہ درحقیقت وہ کانا ہی تھا۔ دوسرے شہزادے نے کہ گفتارِ شیریں رکھتا تھا اور فصاحت کے زیوروں سے مجلّا تھا۔ ہولے سے پوچھا کہ قاعدہ شائستہ لوگوں کا ہے۔ بتاؤ سہی تیرے اونٹ پر کہیں سرکہ تو نہیں لدا ہوا تھا۔ اب تو سوداگر بچہ کو پختہ یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہی اونٹ کو چرانے والا ہے۔ اب کڑک کر بولا کہ نا ہنجار بتا میرا اونٹ کہاں ہے۔ شیریں گفتار نے کہا یہ تو خیر میں نہیں جانتا۔ سوداگر بچہ کہ نہایت اکھڑباز اور رنگ گیر تھا اب

دوسرے شہزادے کے درپے ہوا تو تیسرے شہزادے نے کہ فہم و فراست میں یگانۂ وقت تھا آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور پوچھا کہ بول تو سہی تیرے اونٹ کے دم تھی کہ نہیں۔ میرا تو خیال ہے نہیں تھی۔ اب تو بیوپاری نے ماتھا پیٹ لیا اور کہنے لگا کہ "بہتر ہے کہ تم اونٹ کو مع اسباب لوٹا دو ورنہ میں تمہیں قاضی کے پاس لے چلوں گا۔" شہزادے بولے بسم اللہ ہم تو خود قاضی کے پاس جاتے ہیں۔ جب یہ چاروں قاضی کے پاس پہنچے تو سارا ماجرا سوداگر بچے نے اس کے روبرو بیان کیا۔ تینوں شہزادوں نے دعویٰ کیا کہ اس کا شک بے بنیاد ہے اور ہم نے اونٹ کو دیکھا تک نہیں۔ قاضی نے پوچھا تو پھر تم کو اس اونٹ کے متعلق اتنی معلومات کیسے حاصل ہو گئیں؟۔ بڑے شہزادے نے کہ صاحب حسن تھا جواب دیا کہ اے قاضی مجھے اس امر سے دریافت ہوا کہ اونٹ کانا ہے کہ راستے میں تمام درختوں کے پتے ایک طرف سے چرے تھے، جو اونٹ کے دونوں دیدے سلامت ہوتے تو دوسری طرف سے بھی پتے کھاتا۔۔۔

دوسرا شہزادہ کہ جس کے منہ سے دم گفتار پھول جھڑتے تھے گویا ہوا۔ اے قاضی قاعدہ ہے کہ جس جگہ زمین پر سر کہ گرتا ہے۔ وہاں کی زمین اُبل اٹھتی ہے۔ میں نے جابجا اس حقیقت کا معائنہ کیا اور اسی لئے جانا کہ اونٹ پر سرکہ لدا تھا۔ تیسرا شہزادہ کہ فہم و فراست میں یکتائے زمانہ تھا کہنے لگا اے قاضی راہ میں جابجا اونٹ کے بیٹھنے کی علامتیں موجود تھیں۔ وہ نشان کہ اونٹ کی دم سے